(غلام گردش)

ترمذی، کراچی اور پی آئی اے

طارق شریف کا فون آیا کہ آنا ہے، بیٹی کی شادی ہے۔ کراچی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر جب بچی کی شادی کا بتایا گیا تو نہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کوئی بہانہ بھی نہیں تھا۔ طارق فوج سے بریگیڈیئر کے طور پر چند سال پہلے ریٹائر ہو کر کراچی منتقل ہو گیا ہے۔ شروع میں اسکے فیصلے سے قدرے اختلاف تھا مگر اب لگتا ہے کہ اسکا فیصلہ بالکل درست تھا۔ انتہائی صائب۔

ایک دن بعد کامران نشاط کا فون آیا کہ ائیر پورٹ خود آؤنگا اور اصرار تھا کہ میرے گھر قیام کرنا ہے۔ کامران بھی مردِ عجیب ہے۔ لائل پور کی مٹی میں گندھا ہوا انسان۔ آج سے تین دہائیوں پہلے کراچی منتقل ہو گیا۔ فیصلہ والد کا تھا۔ اس وقت کامران بیس پچیس سال کا ہوگا۔ سارے خاندان نے والد کے مشکل فیصلے پر سر تسلیم خم کیا اور لائل پور سے چلے گئے۔ وہاں جا کر پورے خاندان نے بھرپور ترقی کی۔ آج کل کامران، دوائیوں کی بہت بڑی کمپنی مولر اینڈ فپس کا سی او اے ہے اور بہترین زندگی گزار رہا ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ میں فلاں شہر میں رہتا ہوں۔ اس آدھے سچ کو کم از کم میں تسلیم نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شہر انسان میں رہتا ہے۔ جیسا شہر ہوتا ہے، مقیم بھی ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ دنیا کے تمام شہر جو سمندر کے ساتھ ہیں اور ان میں بین الاقوامی بندرگاہیں ہیں، ہمیشہ سے ترقی کرنے کے عمل میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ کراچی کا بھی یہی حال ہے۔ اس شہر کے مزاج میں اعتدال ہے، معاشی ترقی ہے اور ایک ذہنی وسعت ہے۔ یہ تمام خوبیاں، لسانی، مذہبی اور عسکری اداروں کی باہمی جنگ بھی ختم نہ کر سکی۔ کامران کو عرض کی کہ کراچی میں ہوٹل میں قیام کرونگا۔ باقی سارا دن اکٹھا گزارینگے۔ دیگر دوستوں سے رابطہ کیا تو اشعر شاہ اور خلیل جانے کیلئے پہلے ہی سے تیار تھے۔ پنڈی سے اعظم ٹوانہ کہنے لگا کہ کندھا منجمد ہو چکا ہے اور شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ لہذا سفر سے معذرت کر لی۔ بات درست تھی۔ قطعاً بہانہ نہیں تھا۔ ٹوانہ کا تعلق بھی لائل پور سے ہے۔ آج کل پنڈی رہ رہا ہے۔ یاد ہے اسکے والد ریٹائرڈ سکوڈرن لیڈر تھے۔ کمال کے مہذب انسان۔ اعظم بچپن ہی سے محفل میں رنگ جما دیتا ہے۔ باتیں اور لطیفوں کا عجیب سا سنگم۔ زندگی سے بھرپور انسان۔ اسکے نہ جانے اور بیماری کا سنکر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ پھر سچ سامنے آیا کہ اب ہم چودہ پندرہ برس کے بچے نہیں بلکہ ساٹھ سال کے قریب کے بزرگ ہیں۔ سفید بالوں والے بلکہ کئی تو بالوں سے بالکل فارغ ہو چکے ہیں۔ پھر بھی انہیں "فارغ البال" نہیں کہا جا سکتا۔ راجہ آصف کا جواب مختلف تھا۔ وہ جس شوگر مل کی انتظامیہ کا حصہ ہے، وہاں کے حالات ایسے تھے کہ کراچی نہیں آ سکتا تھا۔ ہاں ویسے اگر کسی نے عذاب کا ٹکڑا خریدنا ہے تو اسے فوراً کسی قسم کا کارخانہ لگا لینا چاہیے۔ چالیس کے قریب سرکاری محکمہ مختلف طریقوں سے رشوت لینے پہنچ جاتے ہیں۔ اسکو اپنا حق سمجھ کر مانگتے ہیں۔ کسی قسم کی کوئی شرمندگی یا الجھن کے بغیر۔ اعظم ٹوانہ اور راجہ آصف دونوں کراچی نہیں گئے۔

اشعر شاہ سے بات کی تو کہنے لگا کہ ایک ہی فلائٹ پر کراچی چلیں گے۔ سر تسلیم خم، فوراً شاہ جی کا حکم مان لیا۔ شاہ جی کمال آدمی ہیں۔ پرائیویٹ نوکری کرتے ہیں۔ ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔ ایک ایسا اعلیٰ ظرف انسان جو اپنے دوستوں کی خوشی کو مقدم سمجھتا ہے اور ہر دم خوش رہتا ہے۔ عرض کرتا چلوں۔ جس مصنوعی ماحول میں ہم سانس لیتے ہیں، اس میں دل سے قہقہے لگانا ایک نعمت سے کم نہیں۔ ورنہ ہماری

ہنسی اور مسکراہٹ بھی بے معنی سی ہے۔خلیل خان نے اعلان کردیا کہ وہ ٹرین پر لاہور سے کراچی پہنچے گا اور سیدھا کامران کے گھر جائیگا۔خیر جب ائیر پورٹ پہنچا تو شاہ جی غائب تھے۔فون کیا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ گھر بھول آئے ہیں۔شکر ہے کہ ٹکٹ موبائل فون میں محفوظ تھا۔کوئی عملی دشواری نہیں ہوئی۔اب اس کالم کے مرکزی نکتہ کی طرف آتا ہوں اور وہ ہے پی آئی اے۔

قومی عادت ہے کہ ملک کے ہر ادارے کو کوستے رہتے ہیں۔ہر چیز کی برائی کرنا فرض سمجھتے ہیں۔اس میں حد درجہ کامیاب بھی ہیں۔اگر آپ گریہ کرنے پر قومی ترقی کو معمور کرلیں تو پاکستانی شہری دنیا میں صفِ اول پر نظر آئینگے۔ہر بات میں کیڑے نکالنا، کج بحثی ،اب ہمارا شخصی نہیں قومی وطیرہ ہے۔پوری دنیا گھوم چکا ہوں مگر کسی بھی غیر ملکی شہری کو اپنے ملک کو اس درجہ لعن طعن کرتے نہیں سنا، جتنا ہم ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔بھول گئے ہیں کہ سب کچھ اسی ملک کی بدولت ہے۔تقسیم برصغیر سے پہلے لاہور بلکہ پورے ہندوستان میں مسلمان کتنے امیر تھے،سب کو معلوم ہے؟اکثر مسلمان معاشی طور پر ہندو اکثریت کے سامنے دستِ سوال تھے۔مگر سب کچھ حاصل کرنے کے بعد،آج بھی اکثر صاحبِ ثروت انسان ملک کو گالیاں دیتے نظر آتے ہیں۔بھول جاتے ہیں کہ تقسیم ہند کے وقت مسلمان معاشی کسمپرسی میں تھے۔آج جن قیمتی گاڑیوں پر سفر کررہے ہیں،جن بیش قیمت مکانوں میں رہ رہے ہیں،سب کچھ اسی ملک اور آزادی سے منسلک ہے۔ورنہ ہمسایہ ملک میں ذرا مسلمانوں کی بدحالی دیکھ لیجئے۔خیر پی آئے اے میں اَن گنت بار سفر کرتا رہتا ہوں۔کوشش کرتا ہوں کہ باہر کے ملک بھی جانا ہو تو قومی ائیرلائن سے جاؤں۔چند دن قبل کے سفر میں قابل ذکر تبدیلی دیکھی۔ایک تو فلائٹ دونوں اطراف ہے،یعنی لاہور سے کراچی اور واپسی،بالکل وقت پر تھی۔بلکہ واپسی پر جہاز چھ منٹ پہلے پہنچ گیا۔دوسری بات یہ،کہ عملہ کا نیا لباس تھا۔ائیر ہوسٹس سے لیکر جہاز کے برسر تک نئی یونیفارم میں ملبوس تھے۔میرے لیے یہ خوشگوار حیرت تھی۔اندازہ نہیں کہ یہ فیصلہ کب کیا گیا۔لیکن جس نے بھی کیا،بہترین فیصلہ ہے۔اسکی تعریف کرنی چاہیے۔تیسری بات جو مجھے انتہائی خوشگوار معلوم ہوئی،وہ فضائی عملہ کا مسافروں سے رویہ تھا۔انکی کوشش تھی کہ مسافروں کی زیادہ سے زیادہ دیکھ بھال کی جائے۔انہیں زیادہ سے زیادہ کھلایا جائے اور انہیں انتہائی آرام میں رکھا جائے۔یہ رویہ اکثر بین الاقوامی ائیرلائنز میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔لوگ ترکش ائیرلائنز کی تعریف کرتے ہیں۔مگر اس ائیرلائن پر درجنوں بار سفر کرکے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پاکستانی مسافروں کی دیکھ بھال کم ازکم ائیرلائن مقدم نہیں سمجھتی۔مصنوعی قسم کا ماحول اور فضائی میزبانوں کا قدرے درشت رویہ۔اس فضائی کمپنی میں میرے علاوہ،کئی دوستوں نے بھی محسوس کیا۔مگر پی آئی اے کا عملہ اپنے حسنِ اخلاق کی بدولت بہترین گنا جاسکتا ہے۔بہرحال لاہور سے کراچی تک فلائٹ میں عملہ حد درجہ خوش اخلاقی سے پیش آرہا تھا۔اسی فلائٹ میں نئی یونیفارم میں ملبوس،ہلکی ہلکی سفید داڑھی والا ایک برسر بھی کام کررہا تھا۔جس مستعدی سے فضائی میزبانوں کی عملی کارکردگی پر کڑی نظر رکھ رہا تھا،وہ حد درجہ مستحسن تھا۔کافی منگوائی تو دیکھا کہ وہ یہ تک چیک کررہا ہے کہ کپ،ٹرے کے بالکل درمیان میں رکھا ہوا ہے یا نہیں۔اتنا باریکی سے کام ہوتا ہوا کم ازکم پاکستان میں بہت کم نظر آتا ہے۔پوچھنے پر معلوم ہوا،نام حسن ترمذی ہے۔عرصے سے پی آئی اے سے منسلک انسان،عمدہ طریقے سے کام کررہا تھا۔یہ جانفشانی قطعاً قطعاً مصنوعی نہیں تھی۔معلوم ہورہا تھا کہ اپنی ذمہ داری دل وجان سے پوری کررہا ہے۔اپنی قومی ائیرلائن کی یہ نئی روش بہت بہتر معلوم ہوئی۔

کراچی میں کامران، اشعر اور خلیل کے ساتھ رات نو بجے جب گالف کلب پہنچے تو شادی گھر مکمل طور پر خالی تھا۔ ہمیں لاہور کی عادت ہے جہاں شادیاں پورے دس بجے ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر کراچی میں کسی بھی شادی پر جانے کا وقت ہی دس بجے ہے۔ دس بجے دوبارہ پہنچے تو تھوڑی سی گہما گہمی تھی۔ طارق شریف اپنے اہل خانہ کے ساتھ موجود تھا۔ فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ پرانی یادیں اور ماحول، ایک دم سامنے آ گیا۔ وہی جناح کالونی کے قہقہے اور شرارتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وقت سمٹ سا گیا ہے۔ شاہ جی نے ماضی کے چند پرانے قصے، نئی ترتیب سے سنا ڈالے۔ خلیل اکثر خاموش رہتا ہے۔ ہر محفل میں جاتا ہے مگر خاموشی سے بیٹھا رہتا ہے۔ خیر اس دن طارق بہت مصروف تھا۔ کراچی کے سماجی ماحول میں تہذیبی کشادگی ہے۔ اس میں پنجاب یا پنجاب کے مقتدر طبقہ کی مصنوعی کرختگی نہیں ہے۔ کراچی کا دولت مند ترین شخص بھی ذاتی نمائش اور تشہیر سے کوسوں دور ہے۔ ہمارے ہاں تو لوگوں کو یہاں تک بتایا جاتا ہے کہ کس گاڑی میں آئے ہیں۔ کپڑے کس مہنگی دکان سے خریدے ہیں۔ پچھلے مہینے کس غیر ملک میں جانا ہوا ہے۔ کراچی کے لوگ اگر حال آسودگی میں ہیں تو اسکا ذکر کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ شائد سندھ کی روایتی شائستگی، کراچی کے اکثر لوگوں میں سرایت کر چکی ہے۔ شادی کی رخصتی تقریباً ایک بجے کے بعد ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ شادیوں میں دس بجے تک کی پابندی کو پورے ملک میں لاگو ہونا چاہیے۔ کم از کم اس سے وقت ضائع نہیں ہوتا اور اگلے دن کام پر جانے والے لوگوں کیلئے بھی سہولت رہتی ہے۔ بہر حال انتہائی شاندار شادی تھی۔ پُر رونق اور رنگوں سے آراستہ۔

اگلے دن واپسی پر بھی پی آئی اے میں وہی نیا پن محسوس ہوا جو پچھلے دن ہوا تھا۔ وقت پر جہاز چلا اور قدرے پہلے لاہور پہنچ گیا۔ واپسی پر سوچ رہا تھا کہ ہم اپنے قومی اداروں پر ہر وقت تنقید کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں شائد کوئی نفسیاتی بیماری ہے کہ اپنے ملک کو ہر وقت طنز کا نشانہ بنا کر رکھتے ہیں۔ مگر ہماری قومی ائیر لائن میں حسن ترمذی جیسے مستعد اور کام کرنے والے لوگ بھی ہیں جنکی محنت کی بدولت اداروں کی عزت بڑھتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ نظام میں خرابیاں بھی اَن گنت ہیں۔ مگر خوبیوں پر بھی تو نظر رکھنی چاہیے۔ مگر یہاں تو محنت کر کے سقم قلاش کیے جاتے ہیں۔ اچھائی اور کسی کی تعریف کرنا گناہ ہے یا شائد گناہ کبیرہ!

راؤ منظر حیات